مقالات

ہندوستان میں اسلامی تہذیب

از پروفیسر ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب

(یہ اس انگریزی خطبہ کا ترجمہ ہے جو ڈاکٹر صاحب نے گذشتہ ماہ اگسٹ میں "مسلم کلچر سوسائٹی حیدرآباد" کے تحت ایک جلسۂ عام میں پڑھا تھا۔ خطبہ کی اہمیت متقاضی ہے کہ ناظرین غور سے اس کا مطالعہ فرمائیں۔)

سوال کیا گیا ہے اور بار بار دہرایا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب کیا چیز ہے اور ہندوستان میں کہاں پائی جاتی ہے؟ ایک زمانہ تھا جب کہ مشکل ہی سے کسی کے ذہن میں یہ سوال کرنے کا خیال آسکتا تھا۔ علمی صحبتوں میں ہم ہندو مسلم انگریزی اور دوسری مخصوص جماعتی تہذیبوں کے متعلق دل کھول کر گفتگو کیا کرتے تھے اور اپنے گذشتہ کارناموں کو جو علوم و فنون، فلسفہ، اور زندگی کے دیگر مظاہر میں رونما ہوئے یاد کرکے لطف اندوز ہوتے تھے۔ کسی جماعت کو یہ خیال نہ تھا کہ دوسری جماعت کے تہذیبی ورثہ سے انکار کرے، اگرچہ ہر جماعت اپنے من سمجھوتے کے لیے ہر چیز کی قدر و قیمت متعین کرنے کا ایک خاص معیار قرار دے لیا کرتی تھی۔ یہ ایک فطری طریق کار تھا جس میں اب انتشار پیدا کیا جا رہا ہے اور ہم سے قومیت کے نام پر یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم اپنی انفرادی تہذیب کو نظر انداز کر دیں۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جدید تمدن کی روشنی میں بالخصوص مسلمانوں کی تہذیب کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ صرف شبہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ تحدی کی جاتی ہے کہ آیا موجودہ زمانہ میں یہ تہذیب کسی زندہ متحرک صورت میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے ہر گوشہ میں تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بے چینی

سی پیدا ہوگئی ہے۔

مسلم تہذیب کا مسئلہ فرقہ بندی نہیں بادی النظر میں یہ ایک سادہ سا سوال ہے، اور علمی بنیاد پر اس کا جواب بہت سیدھے سادھے طریقہ سے دیا جاسکتا ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے، اور یہ ایک بدنصیبی ہے کہ یہ سوال خالص علمی وجوہ سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کا اصل منشا ایسی معلومات حاصل کرنا نہیں ہے جن سے انسانی زندگی کے لیے اسلامی تہذیب کی قدر وقیمت سمجھنے اور اس کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو۔ بلکہ اصل منشا یہ ہے کہ مسلمان جو اپنی تہذیب کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں ان کی راہ میں اس سوال سے ایک اچھی رکاوٹ کا کام لیا جاسکے۔ یہ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ایک اور مصیبت بھی ہے۔ جن لوگوں نے یہ سوال ایجاد کیا ہے ان کے لائحۂ عمل کا ایک جز یہ بھی ہے کہ جب کوئی ان کے سوال کا جواب دے تو "فرقہ پرستی" کا آوازہ کس کر اس کا منہ بند کردیں۔

یہ ہے اس وقت کی صورت حال اور یہ عجیب صورت حال ہے۔ آپ ایک سوال کرتے ہیں مگر اس کا جواب سننا نہیں چاہتے۔ یا سن بھی لیتے ہیں تو ایک سبق جو اپنے پہلے سے یاد کر رکھا ہے اسی کو رٹتے چلے جاتے ہیں کہ: "ہم نہیں مانتے، یہ سب فرقہ پرستی ہے" ــــ اسی لیے آج اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مجھے آپ ہی آپ کچھ جھجک سی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرے خیالات کا غلط مفہوم لیا جائے اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ اتنی در دسری کے بعد اسی الزام (فرقہ پرستی) سے میری بھی تواضع کی جائے۔

واضح رہے کہ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور سیاسی بولی کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتا لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ کسی نقطۂ نظر یا کسی خاص فلسفۂ زندگی کی توضیح کرنا یا لوگوں کی بے خبری دور کرنے کے لیے کسی ایسی حقیقت کا اظہار کرنا جو ہمارے علم میں ہو، فرقہ پرستی نہیں ہے۔ اسی طرح کسی قوم کی تہذیب پر بحث کرنا اور یہ بتلانا کہ اس کا ذہن کس طرح اس کی زبان وادب میں، اس کے علوم وفنون

اور فن تعمیر میں، اس کے افکار و اعمال میں، اس کے شخصی قوانین اور معاشرتی و معاشی نظام میں اور اس کے تصور حیات میں صورت پذیر ہوا ہے، یا اس امر کی صراحت کرنا کہ یہ سب چیزیں مل جل کر کس طرح اس کی جداگانہ سیرت کی تشکیل کرتی ہیں، بالیقین فرقہ پرستی نہیں ہے۔

ہر تہذیب ایک زندہ نظام ہوتی ہے۔ عموماً وہ کسی خاص قوم کی معاشرت سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور پھر اسی پر اثر ڈال کر تازہ قوت حاصل کرتی ہے۔ اس کی ترقی اور اس کا تنزل و تنزل اسی قوم کی زندگی کے ساتھ ہوتے ہیں جو اس کی حامل ہو۔ اور بعض تہذیبیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک زندہ تخیل کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ اور زندگی کے کسی روحانی قانون کا منشا پورا کرتی ہیں۔ اس قسم کی تہذیب پھیل کر عمومیت کے ساتھ نوع انسانی پر اثر ڈالتی ہے اور اختلافِ رنگ و نسل کے متصادم اغراض میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اس کا اپنا کوئی خاص مسکن نہیں ہوتا۔ وہ جہاں جاتی ہے اور جو لوگ اس کا اثر قبول کرتے ہیں ان کو وہ اپنا نام دے دیتی ہے۔ اگر وہ ہاتھ کمزور ہو جائیں جو اس کو تھامے ہوئے ہوں تو اُن سے چھوٹ کر وہ ناپید نہیں ہو جاتی بلکہ دوسرے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا نام ان کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ اس طرح وہ زندہ رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ ہم اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ان لوگوں سے نہیں کرتے جن کے ہاتھوں میں سے اس کے سنبھالنے کا سکت نہیں رہا بلکہ ان لوگوں کے لحاظ سے اسے جانچتے ہیں جن کے ہاتھوں نے اسے مضبوطی کے ساتھ تھاما ہو یا جنہوں نے اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم خود اس کی ذاتی قوت سے اس کی نسبت رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ کسی ہنگامی سیاسی غرض کے لیے ایسی تہذیب سے جھگڑا کیا جائے بلکہ دانشمندی کا اقتضاء یہ ہے کہ اس سے نوع انسانی کی ترقی کے لیے ایک مددگار قوت کی حیثیت سے استفادہ کیا جائے۔

ایسی ہی ایک تہذیب ہے جس کے متعلق آج کی شام میں آپ کے سامنے کچھ کہنا چاہتا ہوں اور

مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنا فرقہ پرستی نہیں ہے۔ اس حد تک اگر آپ مجھ سے متفق ہو جائیں تو میرا کام بہت کچھ ہلکا ہو جائے گا کیونکہ پھر مجھے اس سوال کے سیاسی پس منظر کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ تاہم دو ایک باتیں اور ہیں جن کو میں آگے بڑھنے سے پہلے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔

اسلامی تہذیب کا موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس پر ایک لکچر میں بحث کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میں اسے پیش کرنے کے لیے کونسا نہج اختیار کروں گا جس سے بآسانی یہ سمجھا جا سکے کہ یہ تہذیب کیا ہے اور ہندوستان میں کہاں پائی جاتی ہے۔

مسلمان کے ذہن نے تاریخ کے دوران میں اپنی خصوصیات کو تہذیب کے ہر میدان میں نمایاں کیا ہے ـــــ میدانِ عمل، میدانِ فکر، میدانِ تخلیق ـــــ یہی تین بڑے میدان ہیں جن میں انسان کی پوری کارگذاری منقسم ہوتی ہے اور ان میں سے ہر میدان میں مسلمان نے اپنا ایک نقش قائم کیا ہے۔ عمل کے میدان میں اس نے ایک خاص قسم کا نظامِ معیشت و معاشرت اور ایک خاص قسم کا نظامِ سیاست و عمران پیدا کیا جو خود اس کے اپنے اصول قانون کا پروردہ ہے اور ایک ہمہ گیر ضابطہ کی شکل اختیار کر گیا ہے جس کا نام شریعت ہے۔ میدانِ فکر میں اس کی فطانت نے جدید سائنس کا سنگ بنیاد رکھا اور اس کے آئندہ ارتقاء کی راہ متعین کر دی۔ میدانِ تخلیق میں اس نے اپنی روح کی حرکت سے زندگی کے جمال کو نکھارنے اور مالا مال کر دینے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اسی طاقت ہی کا ظہور تو ہے جو اس کے ادب میں، اس کے فنونِ لطیفہ میں، اس کے فلسفہ و مذہب میں ہوا ہے۔ غرض یہ ایک جامع تہذیب ہے جس کا ہر پہلو بذاتِ خود ایک بڑا موضوع ہے۔ ہر تہذیب کی طرح خصوصیت کے ساتھ اس کا معاشری پہلو وقتاً فوقتاً دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوتا رہا ہے اور یہ اثر زیادہ تر ادنیٰ درجہ کے جزئیات میں نمایاں نظر آتا ہے جس کی وجہ کچھ تو موسمی حالات ہیں، کچھ وہ ضروریات ہیں جو مختلف ملکوں میں پھیلنے اور مختلف قوموں کے ساتھ رہنے سہنے سے پیدا ہوئیں، اور

کچھ انفرادی مذاق اور شخصی بے راہ رویوں کے نتائج ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود اس کا ڈھانچہ اپنی پوری ہیئت ترکیبی کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی پر مضبوط جما ہوا ہے۔ اس کے وجود کو معرض سوال میں لانا اور یہ پوچھنا کہ اسلامی تہذیب کیا ہے؟ اور کہاں پائی جاتی ہے؟ ایک ایسا فعل ہے جس کو میں بہت نرم الفاظ میں عقلی خود فریبی سے تعبیر کرونگا۔ میں آپ کو اس سے خبردار کردینا چاہتا ہوں۔ اسلامی تہذیب یہاں ہندوستان میں اسی طرح موجود ہے جس طرح وہ ان ممالک میں موجود ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور اس سے آنکھیں بند کرلینے کی نسبت زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کے وجود کو کھلے دل سے تسلیم کرلیا جائے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ اس ملک کو بلند ترین سیاسی ارتقاء کے مرتبہ تک پہنچانے میں اس سے کس طرح مدد لی جاسکتی ہے۔ آج کی تقریر میں میرا مدعا اس امر پر زور دینا ہے کہ مسلمانوں کی یہ تہذیب اب بھی زندہ ہے اور اس مقصد کے حصول میں مدد دینے کی طاقت رکھتی ہے۔

میں ان مختلف شعبوں پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا جن میں اس تہذیب نے تاریخ کے دوران میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے کیونکہ یہ ایک قسم کی علمی نمائش ہوگی اور آپ کے لیے بھی بار خاطر ہوجائیگی۔ بخلاف اس کے میں آپ سے یہ خواہش کرونگا کہ آپ اس روح کو محسوس کریں جو مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں کارفرما رہی ہے اور ان کی تہذیب کی پوری عمارت کو تھامے ہوئے ہے۔ بالفاظ دیگر میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بنیاد پر توجہ کریں جس پر اسلامی تہذیب قائم ہے۔ اگر اس بنیاد کو صحیح طور پر سمجھ لیا گیا تو میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلمانان ہند کے تہذیبی تحفظات کو سمجھنے میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں بڑی حد تک دور ہوجائیں گی۔

پنڈت نہرو کے خیالات پر تبصرہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لیے ایک مددگار قوت ہونیکی حیثیت سے اسلامی تہذیب کی قدر و قیمت کو سمجھنے میں جو دشواری پیش آتی ہے اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ جو لوگ اس کو معرض سوال میں لاتے ہیں وہ غیر متعلق خیالات میں بھٹک گئے ہیں اور اس امر کا

کوئی صحیح تصور ہی ان کے ذہن کی گرفت میں نہیں آسکا ہے کہ تہذیب کہتے کس چیز کو ہیں اور وہ کن عناصر ترکیبی سے وجود میں آتی ہے۔ اپنے مطلب کو ذہن نشین کرنے کی خاطر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ شروع ہی میں آپ کو ایسے خیالات سے متنبہ کر دوں۔ مثال کے طور پر میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان کو خاص وجہ سے منتخب کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی خاموش فضا میں رہکر میں اپنے ملک کے قائدین کے کارناموں کا مدت سے خاموشی کے ساتھ مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پنڈت جی ان چند افراد میں سے ہیں جو کسی بڑے مقصد کو بنا یا بگاڑ سکتے ہیں۔ ان کے اندر خلوص کے ساتھ کام کرنے کی کافی ہمت و قوت ہے اور اسی لیے یہ امر بہت زیادہ افسوسناک ہوگا کہ ان کی ہمت و قوت خاص کر اس زمانہ میں جب کہ وہ ایک بڑے اعتماد اور اثر کے مرتبہ پر فائز ہیں، ہندوستان کے اسلامی مسئلہ سے غلط یا نامناسب طریقہ پر تعرض کرنے میں ضائع ہو۔ وہ فرماتے ہیں:-

> "میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ "اسلامی تہذیب" کیا ہے لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان اور ان ہی کی طرح ہندو فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں:- ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دینا۔ اور ایک خاص قسم کی ٹونٹی والا لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں یعنے دھوتی پہننا سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی در اصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل سے فرق کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ شاذ ہی ڈاڑھی رکھتا ہے۔

اگرچہ علی گڈھ ابھی تک سرخ ترکی ٹوپی کا گرویدہ ہے (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا) مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں۔ خود میرا ذوق ان میں سے بعض عادتوں کو پسند نہیں کرتا اور میں ڈاڑھی مونچھ یا چوٹی نہیں رکھتا۔ لیکن میں اپنے ذوق کا قانون دوسروں پر مسلط کرنے کی بھی خواہش نہیں رکھتا۔ اگرچہ ڈاڑھی کے متعلق مجھے اعتراف ہے کہ جب امان اللہ نے کابل میں ڈاڑھیوں کا صفایا شروع کر دیا تو مجھے بڑی مسرت ہوی تھی۔"

اس عبارت میں آپ دیکھیں گے کہ پنڈت جواہر لال نہرو مسلمانوں کے ذہن اور روح کے مظہر کو جو اصل تہذیب ہے ان کے پاجاموں، ان کی ترکی ٹوپی، اور ان کی ڈاڑھی میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا ایک سنجیدہ محقق کے لیے حقائق کی دریافت کا یہی طریقہ ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ اپنے ذاتی تعصبات رکھتا ہے۔ ہم سب میں یہ عیب تھوڑا بہت موجود ہے۔ یہ خلقی کمزوری بالعموم صحیح رائے قائم کرنے میں مزاحم ہو جاتی ہے۔ مگر جب تعصبات مکابرے اور تمدی کی قسم کے ہو جاتے ہیں تو نظر کا توازن بگڑ جاتا ہے۔

اپنی خود نوشتہ سوانح حیات کے اس باب میں جس سے میں نے اقتباسات پیش کیا ہے پنڈت نہرو بیان کرتے ہیں کہ ترکی نے مذہب چھوڑ دیا ہے — ایران اپنی تہذیب میں جان ڈالنے کے لیے اسلام سے پہلے کے دور کی طرف رجوع کر رہا ہے — حتیٰ کہ مصر بھی اس راستہ پر گامزن ہے اور اپنی سیاست کو مذہب سے الگ کر رہا ہے — آگے چل کر میں تبلاؤں گا کہ جس چیز کو وہ ان ممالک میں تغیر سمجھتے ہیں اس کی حقیقت کو سمجھنے سے وہ اسی طرح قاصر ہیں جس طرح ہندوستان کی اسلامی تہذیب ان کی سمجھ میں نہیں آئی — بہرحال انہی مفروضہ تغیرات کی بنیاد پر وہ سوال کرتے ہیں کہ

"مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ برطانیہ کی شفیق حکومت کے

تحت شمالی ہند میں پھلتی پھولتی رہیں گی؟ "

اور خود اس کا جواب دیتے ہیں کہ: ۔

" مسلم قوم کے وجود کا خیال چند لوگوں کی قوت واہمہ کا کرشمہ ہے۔ اگر اخبارات اس خیال کو اس قدر شہرت نہ دیتے تو یہ نام بھی بہت کم لوگوں نے سنا ہوتا۔ اور اگر بہت سے لوگ اس پر یقین بھی رکھتے تب بھی حقیقت کی ایک جھلک اس کو کافور کر دیتی۔"

مجھے اندیشہ ہے کہ اس موضوع سے بحث کرنے کا یہ انداز کچھ حقارت سا ہے اور مزید برآں حسب سابق غیر علمی بھی ہے۔ شبہ استدلال کا ایک خطرناک آلہ ہے۔ اکثر اس سے یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ قائل کو حقائق پر دسترس حاصل نہیں۔ نیز اس سے غلط فہمیوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے طرز فکر اور طرز زندگی کی خصوصیات کو برقرار رکھنے کی خواہش سب ہی میں ہوتی ہے اور یہ ایک فطری خواہش ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی گروہ اپنی تہذیب کا احترام بھی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ کیر کثر کی اس طاقت سے جو اس کی تہذیب پیدا کرتی ہے ایک مشترک نظام حکومت کی ترقی اور بہبودی میں حصہ بھی لے؟

اسلامی تہذیب کی بنیادوں پر بحث کرنے سے پہلے میں پنڈت نہرو کا ایک اور اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ عبارت اُن کی ایک حالیہ تحریر سے ماخوذ ہے۔ اصلی حقائق کی جگہ فروعات میں الجھنے اور پورے چمن کی سیر کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ میں دلچسپی لینے کی عادت کا ایک اچھا نمونہ آپ کو اس عبارت میں ملے گا:۔

" اقوام بہت سی ان چیزوں کو جو ان کی خصوصیات میں سے ہیں جیسے زبان۔ عادات۔ طرز فکر وغیرہ ایک طویل عرصہ تک محفوظ رکھ سکتی ہیں اور رکھیں گی۔ لیکن مشین کا عہد اور سائنس ان میں اپنی سیاحت کی تیز رفتاری اور عالمی خبروں کی مسلسل فراہمی اور ریڈیو اور

سینما وغیرہ سے برابر یکسانیت پیدا کرتے رہیں گے۔ اس ناگزیر رجحان کا کوئی شخص مقابلہ نہیں کرسکتا اور صرف ایک عالمگیر تباہی جو موجودہ تمدن کو درہم برہم کر دے اس کو روک سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے روایتی فلسفۂ حیات میں بہت سے اختلافات ہیں۔ لیکن یہ اختلافات مشکل ہی سے قابل اعتنا رہتے ہیں جب کہ ان دونوں کا مقابلہ زندگی کے جدید سائنٹفک اور صنعتی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے اور اول الذکر دونوں نقطہائے نظر کے درمیان ایک بہت بڑا اختلاف ہے۔ آج ہندوستان میں حقیقی کشمکش ہندو تہذیب اور اسلامی تہذیب کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں میں اور جدید تمدن کی اس سائنٹفک تہذیب میں ہے جو سب پر غلبہ پا رہی ہے۔ اسلامی تہذیب" جو کچھ بھی ہو بہرحال جو لوگ اس کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں انھیں ہندو تہذیب کے مقابلہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس دیو کا مقابلہ کرنا چاہیے جو مغرب کی طرف سے آ رہا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے تو اس امر میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ تمام کوششیں ناکام ہی رہیں گی جو صنعتی تہذیب کے خلاف کی جا رہی ہیں خواہ وہ ہندوؤں کی کوششیں ہوں یا مسلمانوں کی، اور میں بغیر کسی ملال کے اس ناکامی کا مشاہدہ کروں گا۔"

یہاں پنڈت نہرو نے دو قسم کی اشیاء میں امتیاز کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک قسم کی اشیاء تو وہ ہیں جو انفرادی طور پر ایک ایک قوم کے ساتھ مختص ہیں جیسے زبان، عادات، افکار اور فلسفۂ حیات۔ اور دوسری قسم کی اشیاء وہ ہیں جو عمومیت کے ساتھ سب پر اثر انداز ہوتی ہیں، مثلاً وہ چیزیں جو مشین کا عہد فراہم کرتا ہے: سیاحت کی تیز رفتاری، عالمی خبروں کی فراہمی، ریڈیو اور سینما وغیرہ۔ پنڈت نہرو کی رائے میں جو چیز کسی قوم کی تہذیب کو بناتی ہے وہ اشیاء کا آخر الذکر مجموعہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں لغزش کھا کر پنڈت جی کی قوت فیصلہ بے راہ ہو گئی ہے۔ انہوں نے

بس ایک چیز کو دوسری چیز سے خلط ملط کر دیا ہے جن چیزوں کو وہ اقوام کی انفرادی خصوصیات میں شمار کرتے ہیں یعنی زبان عادات طرز فکر — اور بھی بہت سی چیزیں ہیں — دراصل وہی چیزیں ایک قوم کی تہذیب کو ایک مخصوص تہذیب بناتی ہیں اور اسے دوسری قوم کی تہذیب سے متمائز کرتی ہیں۔ مسلمان اپنے فرقہ کی انہی "مخصوص چیزوں" کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح کہ مہاتما گاندھی جیسے مشاہیر بھی اپنی ان چیزوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہند و تہذیب کے لیے مخصوص ہیں۔ رہیں وہ چیزیں جو مشین کے عہد کی پیداوار ہیں تو ہر شخص کو سنجیدگی کے ساتھ خود اپنے نفس سے سوال کرنا چاہیے کہ آیا وہ سینما ریڈیو اور ایسی ہی چیزوں کو اپنی زندگی میں وہی رتبہ دینے کے لیے تیار ہے جیسا مذکورۂ بالا قومی خصوصیات کو؟ ظاہر ہے کہ یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جو قومی زندگی میں کوئی روح پیدا کر سکتی ہوں۔ جب ضرورت ہوتی ہے یہ چیزیں وجود میں آتی ہیں اور جب ان کی ضرورت نہیں رہتی دوسری آسائشیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ ہمارے لیے قوت برقی کی طرح یہ بھی محض غیر شخصی قوتیں ہیں۔ کوئی انسان برقی قوت کو استعمال نہیں کر سکتا تا وقتیکہ اس کو ضابطہ میں لانا نہ جانتا ہو۔ لیکن اس سے واقف ہونا بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ بذات خود تمدن کی کوئی علامت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ مقصد جس کے لیے اس قوت کو استعمال کیا جاتا ہے یا وہ روح جو اس کے استعمال کے پیچھے کارفرما رہتی ہے دراصل وہی زندگی میں ایک فیصلہ کن عنصر ہے۔ آپ قوت برقی کو آرام و آسائش کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور تباہ کن اغراض کے لیے بھی اس کو کام میں لا سکتے ہیں جیسا کہ آج یورپ میں ہو رہا ہے۔ اصل چیز مقصد ہے اور اسی مقصد کی نوعیت یا بالفاظ دیگر زندگی کا نقطۂ نظر ہی وہ چیز ہے جو ایک قوم کی تہذیب اور دوسری قوم کی تہذیب میں امتیاز پیدا کرتی ہے محض سائنس کی آفریدہ چیزوں سے آپ ایک ہمرنگ عالمگیر تہذیب کو ہرگز وجود میں نہیں لا سکتے۔ مشین سے جو یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے وہ زندگی کے محض خارجی اور سطحی پہلوؤں

تک ہی محدود رہے گی مگر وہ آپ کی روح پر قابض نہیں ہو سکتی اور اس کا موجود ہونا اس بات کا پتہ نہیں دیتا کہ اس کے پیچھے ایک عالمگیر نفس کام کر رہا ہے۔ حالانکہ عالمگیر تہذیب ایک عالمگیر نفس ہی سے وجود میں آسکتی ہے اور عالمگیر نفس کا وجود صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ انسان دل وجان سے زندگی کے ایک عالمگیر روحانی و اخلاقی قانون کے زیر اثر کام کرنا سیکھ لے۔ نارمن بنٹ وچ جو بیت المقدس کی عبرانی جامعہ میں بین الاقوامی قانون صلح کے وائزمن پروفیسر ہیں کہتے ہیں کہ

"ہمارے زمانہ کے شدید ترین سیاسی مصائب میں سے ایک یہ ہے کہ جدید سائنس نے انسانی روابط میں اضافہ تو کر دیا ہے اور مختلف اقوام کے درمیان سے زمان و مکان کے فصل کو تقریباً مٹا بھی دیا ہے لیکن بین الاقوامی تعلقات کو قانونِ اخلاق کے تحت لانے میں بہت کم ترقی ہوئی ہے۔ دنیا سیاسی اور معاشی حیثیت سے باہم مربوط ہے۔ آج مثلاً چین و جاپان میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ یورپ اور امریکہ کی قوموں اور مملکتوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ مگر ملکوں کے باہمی تعلقات اخلاقی اصولوں کے تابع نہیں ہیں اور قومیں ایمانداری کے ساتھ اپنے مقدس معاہدات کی پابندی نہیں کرتیں اس لیے روابط کی یہ کثرت و قربت امن عالم کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔ قوموں کے مذاہب جو سب کے سب چند خاص اخلاقی اصولوں کے علمبردار ہیں نیز امن و عدل کے مشترک نصب العین کے حامی ہیں ایک ایسے عالمگیر اخلاقی قانون کی بنیاد پیش کرتے ہیں جس کے نفاذ کے بغیر انسانی تمدن کا برقرار رہنا محال ہے۔"

اسلامی تہذیب کی بنیادی خصوصیت یہی وہ حقیقت ہے جس کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ آپ اس ملک میں کوئی پائدار قومیت محض سطح کی مشترک چیزوں پر تعمیر نہیں کر سکتے۔ تہذیب کا اصلی مستقر انسان کا نفس ہے جو زندگی کے ہر میدان عمل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ یہ نفس مختلف مظاہر تہذیب میں ایک اجتماعی نفس کی حیثیت سے کس طرح ظاہر ہوتا ہے تاکہ ہم ان کے درمیان رواداری کے

عالمگیر اخلاقی قانون کی بنیاد پر باہمی موافقت کا ایک قابل عمل نقشہ بنا سکیں۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اس کو ہم پورا نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمارے سامنے اس تہذیب کا تصور واضح طور پر موجود نہ ہو جسے ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔

اسلامی تہذیب نہ عربی ہے نہ ایرانی جیسا کہ پنڈت جواہر لال کا گمان ہے۔ وہ نہ نسلی ہے نہ قومی بلکہ اگر میں اسے کسی نام سے تعبیر کر سکتا ہوں تو وہ قرآنی تہذیب ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مذہبی تہذیب کہہ لیجیے۔ لیکن قرآنی تہذیب کی حد تک کسی شخص کو مذہب کا نام آنے سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کا مذہب ایسا مذہب نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ مذہب کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ یہ صرف مراقبوں سے پرورش نہیں پاتا۔ یہ نہ مرتاضیت ہے نہ رہبانیت۔ اور نہ یہ ایسی مظاہر پرستانہ رسموں کا مجموعہ ہے جن کو مذہب کے موروثی پیشوا ادا کرتے ہوں۔ یہ محض ایک اعتقاد یا اذعان نہیں ہے۔

اسلام ایک اجتماعی مسلک کی حیثیت سے | اس کے برعکس اسلام کے نام سے جس چیز کو موسوم کیا گیا ہے وہ زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے اور امت مسلمہ سے ایک خاص قسم کا اجتماعی نظام مراد ہے جس کو زندگی کا یہ خاص نقطۂ نظر وجود میں لاتا اور پروان چڑھاتا ہے۔ یہ تصورِ حیات اور یہ نظام اجتماعی فی نفسہٖ جیسا ہے اس کے متعلق آپ گفتگو کر سکتے ہیں بغیر اس کے کہ خدا کا کوئی ذکر آئے، اگر آپ کی افتادِ طبع ایسی ہی ہے کہ آپ خدا کا ذکر سننا نہیں چاہتے۔ اسلام پھر بھی ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے اسلام ہی رہے گا، اور آپ اس کو سلامت روی کا ایک طریقہ پائیں گے۔ وہ ایک خاص قسم کا طرزِ زندگی ہے اسی طرح جس طرح کہ کمیونزم، سوشلزم، فاشزم، اور نازی ازم، خاص قسم کے طرزِ زندگی ہیں۔

ان مختلف طرزوں کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ یہ انسانی قوتِ عمل کو کسی خاص نصب العین یا متعین مقصد کی راہ پر لگانے کی کوششیں ہیں۔ ممکن ہے ایسے لوگ موجود ہوں جو ہر اس مذہب کو جس میں حیات بعد الموت تسلیم کی جاتی ہے فی الحقیقت ناپسند کرتے ہوں۔ ایسے افراد کے لیے کسی خاص عقیدے

کا فقدان ہی ایک مذہب ہے۔ کوئی بہتر اصطلاح نہ ملنے کی وجہ سے لوگ اُن کی روش کو مادیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہر حال انہی طریقوں میں سے کسی نہ کسی طریقہ کو ہر شخص اختیار کرتا ہے۔ کبھی محض پیدائش کی وجہ سے ایک طریقہ اس کے لیے آپ مقرر ہو جاتا ہے اور کبھی انسان خود اس کا انتخاب کرتا ہے۔ زندگی کے مختلف طریقوں کا محقق ان کے درمیان موازنہ کرتا ہے اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتا ہے۔ لیکن ایک مخلص پیرو کے نزدیک اس کی عملی پابندی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو پر بھی یہی بات صادق آتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ انہیں اشتراکیت پر اعتقاد ہے، اور یہی بات مسلمان پر بھی چسپاں ہونی چاہیے جب وہ کہتا ہے کہ اسے اسلام پر اعتقاد ہے مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ اس خاص طرز زندگی اور اس خاص نظام اجتماعی پر اعتقاد رکھتا ہے جس کو قرآنی یا اسلامی کہا جاتا ہے۔ آپ اُسے مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے آپ کو بھول جائے یا تمدنی تعلقات اور سیاسیات میں اپنے مسلک کو چھوڑ دے۔ اگر اتفاق سے فریقین کے مسلک بعض معاملات میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہوں یا کم از کم ان کے درمیان براہ راست کوئی تصادم نہ ہوتا ہو تو ان معاملات کی حد تک دونوں ایک راستے پر مل کر چل سکتے ہیں مگر جب بنیادی امور میں دونوں کے طریق فکر و نظر بالکل مختلف ہوں تو نظر فریب دلائل اور سفسطہ کے کسی بڑے سے بڑے طومار سے بھی کوئی کام نہیں چل سکتا یہاں تک کہ حب وطن کے نام پر اپیل کرنا بھی بے نتیجہ رہتا ہے کیونکہ حب وطن کا نام دونوں لیں گے مگر اس کی تعبیر دونوں اپنے اپنے مسلک کے مطابق کریں گے۔ یہی صورت حال ہے جو مسلمانوں اور اس ملک کی اکثریت کے مابین پیدا ہو گئی ہے اور یقیناً تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ ان دو بڑے فرقوں کے اختلافِ نظر کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کر کے یہ تحقیق کیا جائے کہ کس بنیاد پر حقیقی اتحادِ عمل ممکن ہے میں سمجھتا ہوں کہ اختلافات کو نیک نیتی کے ساتھ زیر بحث لانا اتحاد کا پہلا قدم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اتحاد چاہنے اور اختلاف پر گفتگو کرنے میں تضاد نظر آئے مگر اس کا تو مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔

حرکت اور وحدت کی تہذیب جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اسلام ایک ایسا مسلک ہے جو ایک خاص نظام اجتماعی کو پیدا کرنا اور چلانا چاہتا ہے اور اسی لیے زندگی کی دو بنیادی حقیقتوں پر خاص طور سے زور دیتا ہے ان میں سے ایک حقیقت کو میں "حرکت فی الحیات" سے تعبیر کر سکتا ہوں اور دوسری کو "وحدت فی الحیات" یہ دونوں ایک ضابطۂ عمل سے مربوط ہیں جس کو شریعت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپ اس شریعت کو قانون اسلام کہہ سکتے ہیں۔ اسی قانون یا ضابطۂ عمل کے حدود کے اندر ایک مسلمان کو رہنا اور کام کرنا ہے۔ یہ حدود تنگ نہیں ہیں جیسا کہ موجودہ لاعلمی اور انحطاط کی حالت میں نظر آتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں واقعات کی رفتار نے ایک سے زائد مرتبہ اس امر کی شہادت پیش کی ہے کہ جس قدر زندگی کی ان دو بنیادی حقیقتوں یعنی حرکت اور وحدت کو پیش نظر رکھا گیا اُسی قدر شریعت اسلام نے اپنا اثر دکھایا اور اپنے پیرووں کو ضروری طاقت فراہم کر دی۔ ایک معنی میں یہ دونوں حقیقتیں جدا جدا نہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور زندگی کا ایک ہی اخلاقی یا اجتماعی یا روحانی قانون پیش کرتی ہیں جس کو میں شریعت یعنی قانون اسلام کا مقدمہ (Preamble) کہہ سکتا ہوں۔ یہ قانون اٹل ہے اس لیے کہ جس اخلاقی قانون پر اس کی بنیاد قائم ہے وہ زندگی کا ایک فطری قانون ہے۔ میں اپنی ایک تازہ تصنیف میں اس پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں جس کا نام "اسلام میں سوسائٹی کا تصور" ہے۔ اس تقریر کے دوران میں بھی اس کی طرف اشارہ کروں گا۔

متحرک تہذیب یہ حرکت فی الحیات کیا چیز ہے جو اسلامی تہذیب کی بنیاد میں موجود ہے؟ میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آج کی تقریر میں اس تخیل کی فلسفیانہ تشریح کرنا میرا منشا نہیں ہے اور نہ میرے فوری مقصد کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ آپ کو صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآن کے نزدیک زندگی ایک مسلسل حرکت ہے۔ ایک لامتناہی خط مستقیم ہے۔ چکر نہیں ہے۔ وہ متحرک ہے اور ہر آن اس کی ایک نئی شان ہے۔ مغربی سائنس اور فلسفہ میں ارتقا کا تصور کل کی چیز ہے لیکن مسلمانوں میں یہ اتنا ہی قدیم ہے

جتنا کہ قرآن مسلمانوں پر جب بازنطینی مسیحیت کے توسط سے یونانی افکار کا نیا نیا اثر پڑا تو ان کے بعض اہل فکر اس غلط فہمی میں پڑ گئے تھے کہ زندگی ایک جامد و ساکن چیز ہے لیکن زندگی کی قرآنی تعبیر بہت جلد سامنے آگئی اور اس نے مسلمانوں کی عقلی زندگی میں ایسی تحریک پیدا کر دی کہ وہی حقائق علمیہ کی جستجو اور روح تحقیق کے بانی مبانی بن کر رہے۔

علوم و فنون کے دائرہ میں مسلمانوں نے جو کارنامے دکھائے ہیں ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں صرف برے فالٹ کی "تشکیل انسانیت" سے ایک دو اقتباس پیش کروں گا جس سے آپ کو مجموعی حیثیت سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ حرکت کے اس اسلامی تخیل سے تحریک پا کر مسلمانوں نے جو کام کیے وہ کس قدر اہمیت رکھتے تھے :-

" اگرچہ مغربی ترقی کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تہذیب کے گہرے اثر کا سراغ نہ لگایا جا سکے لیکن کسی اور جگہ یہ اتنا واضح اور نمایاں نہیں جتنا اس قوت کی پیدائش میں نمایاں ہے جو دنیائے جدید کی ایک مستقل اور ممتاز قوت اور اس کی فتحمندی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یعنی علوم طبیعی اور روح تحقیق۔" (صفہ ۱۹۰)

" ہمارے سائنس پر عربوں کا احسان بس اتنا ہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہم کو چند انقلاب انگیز نظریات دے دئے ہوں حقیقت میں سائنس پر عربی تہذیب کا اس سے زیادہ احسان ہے۔ وہ خود اپنے وجود کے لیے اس کا احسان مند ہے۔ یونانیوں میں علم ہیئت اور علم ریاضی ایک باہر سے آئی ہوئی چیز تھی جو یونانی تہذیب میں گھل مل نہ سکی۔ یونانیوں نے تدوین، قیاس آرائی، نظریہ سازی ضرور کی لیکن صبر و سکون کے ساتھ لگاتار تحقیق و جستجو کرنا ثبوتی علم کے اجزاء کو سمیٹنا، دقیقہ رس مناہج اختیار کرنا، تفصیلی طریق پر پیہم مشاہدات اور تجربی تحقیقات کرنا یونانی مزاج سے مناسب نہیں رکھتا تھا۔ یونانی اثر کے دائرہ میں صرف

اسکندریہ ہی ایسا مقام تھا جہاں دنیائے قدیم میں علمی تحقیقات کی طرف قدم اٹھایا گیا تھا لیکن جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں تحقیق کی نئی روح اور تجربہ و مشاہدہ اور پیمائش کے نئے طریقوں اور علم ریاضی کی ایسی ترقی سے پیدا ہوئی جس سے یونانی ناآشنا تھے۔ اس روح اور ان طریقوں سے عربوں نے مغربی دنیا کو روشناس کرایا" (صفحہ ۱۹)۔

علمی کام کے مختلف میدانوں میں مسلمان کے ذہن نے جو کچھ کیا ہے اس کا مرقع اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر کھینچا جاسکتا ہے اور اسلامی تاریخ کی مدد سے اس مرقع میں تمام جزئیات جمع کی جاسکتی ہیں مگر وہ سب اسی بنیادی انداز فکر کی طرف اشارہ کریں گی جو قرآنی تعلیم کے اثر سے ابھرا اور بڑھا۔ وہ اثر کیا تھا؟ یہی کہ زندگی ترقی کی ایک سعی پیہم ہے اور اس کی ضروریات کا ایک لازمی جزیہ ہے کہ انسان کے گردوپیش جو فطری قوتیں کام کررہی ہیں ان کے تعامل سے وہ موافقت پیدا کرے اور اس تعامل کا زیادہ سے زیادہ صحیح علم حاصل کرکے قوائے فطرت کو زندگی کے اس اولین مقصد کا خادم بنادے جو عبارت ہے نوع انسانی میں وحدت اور جمعیت کی افزائش سے۔

جدید تمدن سے کوئی تصادم نہیں | جب اصل حقیقت یہ ہے تو میں کہونگا کہ یہ ساری قیل و قال جو اسلامی تہذیب کے متعلق کی جارہی ہے اور یہ جو کہا جارہا ہے کہ جدید سائنٹفک دور کی ترقی کے سامنے اسلامی تہذیب اور اسلامی فکر اپنی خصوصیات کو محفوظ نہ رکھ سکے گی یا سعی و عمل کے راستہ سے دور پھینک دی جائیگی، محض بے معنی ہے۔ میں پنڈت نہرو کو یقین دلاتا ہوں کہ سائنس کے کارناموں سے مسلمان کے ذہن کو خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو چیزیں ان کے نزدیک موجودہ سائنٹفک تہذیب کی اساس ہیں وہ درحقیقت اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ اور اس کی بارآوری کی علامتیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقام سے لے کر جہاں مسلمانوں نے اس کو

چھوڑ دیا تھا اور اس مقام تک جہاں صدیوں کی غفلت اور خود فراموشی کے بعد اب دوبارہ وہ آئے روشناس ہو رہے ہیں، ایک خلا اور وسیع خلا پڑ گیا ہے۔ اس وقت مسلمان جس انحطاط میں مبتلا ہیں (جو نتیجہ ہے متعدد تاریخی اسباب کا اور یہاں ان اسباب پر بحث کرنے کا موقع نہیں ہے) اس نے ان کو استحقار کا ہدف بنا دیا ہے۔ ان کا ذہن غیر اسلامی تہذیبوں کے اثرات کا شکار ہو گیا ہے اور اس قابل نظر نہیں آتا کہ مغرب کی ترقی میں خود اپنی ابتدائی کوششوں کے نتائج دیکھ سکے۔ تاہم تعلیم اس حالت کو درست کر دے گی۔ تمام اسلامی دنیا میں ایک بیداری پیدا ہو چکی ہے اور ان غیر اسلامی حجاب کو چاک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جنہوں نے صدیوں سے مسلمانوں کو اپنے اصلی مقام کا مطالعہ کرنے سے روک رکھا ہے۔ ترکی نے قدم آگے بڑھایا ہے۔ سطحی نظر والوں کو، جو روحِ اسلام سے آشنا نہیں ہیں، ممکن ہے کہ یہ اقدام غیر اسلامی نظر آئے۔ مگر ہم جو اس روح کو جانتے ہیں، ہمیں ان واقعات پر کوئی اضطراب نہیں جو وہاں پیش آ رہے ہیں۔ ایران اپنی کھوئی ہوئی منزلت کو حاصل کر رہا ہے۔ ایک شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ اسلام سے پہلے کی تہذیب کو زندہ کر رہا ہے، مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ فی الواقع ان دونوں ممالک میں اسلامی روح، حریتِ فکر و عمل کے لیے کوشاں ہے اور یہی چیز دوسرے ممالک میں بھی کم و بیش اسی طریقہ پر مقامی حالات و ضروریات کے لحاظ سے ذہن مسلم کی آزادی کے لیے کوشش کر رہی ہے، مثلاً مصر، طرابلس، مراکش، شام، عرب، فلسطین، عراق اور افغانستان جہاں کے مسلمانوں کو یہ فائدہ حاصل ہے کہ ان کے ممالک میں اجتماعی زندگی یکساں اور ہم رنگ ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ ہم ایک وسیع رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور ہمکو ایک غیر مسلم اکثریت کے درمیان زندگی بسر کرنی پڑتی ہے، پھر بھی ہم میں یہ شعور روز بروز پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ دن دور نہیں جب کہ اسلام کا یہ عظیم الشان منطقہ جو بحر اٹلانٹک کے سواحل سے چلکر دو بڑی اقلیموں پر پھیلا ہوا ہے اور جس کی شاخیں جگہ جگہ دونوں طرف نکلی ہوئی ہیں حرکت کرنے والی

معنوں میں اسی اسپرٹ کے ساتھ آن شامل ہوگا جس کو لوگ دور سائنس کی اسپرٹ کہتے ہیں پس اسلامی تہذیب اس قسم کی تہذیب نہیں ہے جو کسی ایسی تہذیب سے متصادم ہوتی ہو جو سائنس کی اساس پر وجود میں آئے۔ یقیناً وہ اس سے اُبھر آئے گی نہیں اس میں زندگی کی وہ قوت موجود ہے جس سے وہ اپنے آپ کو عالم وجود کے متغیر حالات کے ساتھ ہم رنگ و ہم آہنگ بنا سکتی ہے اگر اس سے صحیح طور پر کام لیا جائے تو وہ اس ملک میں بھی زندگی کو پستیوں سے اٹھانے کے لیے ایک بیش بہا سرمایہ ثابت ہوگی۔

اسلامی تہذیب کی بنیاد کا یہ ایک جز ہے اب اس کے دوسرے جز کو لیجیے۔

وحدت کی تہذیب یعنی شریعت | آپ کو یاد ہوگا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ "حرکت فی الحیات" کا مقصود "وحدت فی الحیات" ہے اور یہ دونوں چیزیں مل جل کر ان تمام ساعی اور عملی سرگرمیوں کی اساس بن جاتی ہیں جو مسلمان اپنی زندگی میں کرتا ہے۔ درحقیقت "وحدت فی الحیات" کا قانون اسلام کا روحانی اور اخلاقی قانون ہے۔ ایک ایسا قانون جس پر مدنیت اسلام کی اجتماعی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے اور جس کو منضبط کرنے کے لیے "شریعت" کے نام سے ایک ضابطہ عمل مدون کیا گیا ہے۔ میں زندگی کے اس روحانی قانون کی تشریح و توضیح کرنا چاہتا ہوں جو اس "شریعت" کی تہ میں کارفرما ہے، یعنی قانون وحدت جس سے الگ ہو کر "حرکت فی الحیات" فساد اور تباہی کی موجب بن جاتی ہے۔ اسلامی تہذیب جو اپنے اندر یہ قانون رکھتی ہے سائنس کے ہر کارنامہ کا خیر مقدم کرنے پر تو آمادہ نظر آئے گی لیکن غور کے ساتھ وہ یہ دیکھے گی کہ آیا یہ کارنامے وحدت فی الحیات کے لیے کارآمد یا اس کی ترقی میں مددگار ہیں یا نہیں؟ جہاں اس قسم کا افادہ نہ ہو وہاں اسلامی ذہن سائنس کے اس کارنامے کو ایک جز و حیات کی حیثیت سے قبول کرنے پر مائل نہ ہوگا۔ اگر ہمارے ذہن کی اس خصوصیت کو وہ لوگ سمجھ جائیں جو دنیاوی اُمور میں ہم سے اشتراک عمل کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے

روزمرہ کے تعلقات درست کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ وہ چیز جس میں ہم ردوقبول کی بنیاد پر کوئی مصالحت (Compromise) نہیں کرسکتے اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ وہ زندگی کی تمام مساعی کا وہ اخلاقی سانچہ اور اخلاقی ڈھنگ ہے۔ جو اسلام نے اپنے پیرؤں پر لازم کردیا ہے۔ اگر لوگ پیٹ اور اس کے مطالبات کی بنیاد پر کوئی مسلک اختیار کریں گے اور یہ چاہیں گے کہ مسلمان زندگی کے اس اخلاقی پہلو سے بے پرواہ ہوکر اس مسلک کو قبول کرلیں تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ انھیں اس میں ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ اخلاقی اساس کیا ہے؟ میں اسلام کے بنیادی عقیدے یعنے توحید الٰہی کی تشریح میں آپ کا وقت لینا نہیں چاہتا۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہاں مجھے صرف اجتماعی وعمرانی معاملات میں اس عقیدے کے اثرات سے سروکار ہے۔ ہمارے نزدیک توحید الٰہی اپنا اثر توحید انسانی میں ظاہر کرتی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں نوع انسانی ایسے افراد سے مرکب ہے جو مساوی روحانی مرتبہ لیکر پیدا ہوتے ہیں۔ ہرانسانی روح ایک ہی جوہر سے بنتی ہے۔ یہ قرآن کی تعلیم ہے۔ کسی شخص کی روح پیدائشی داغدار نہیں ہے اور نہ اس کو کسی ایسے گناہ کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے جو خود اس سے کسی پہلے جنم میں یا اس کے کسی مُورثِ بعید سے صادر ہوا ہو۔ وہ خود اپنے عمل کے سوا کسی چیز کا ذمہ دار نہیں۔ یہی وہ بنیادی نقطہ ہے۔ جہاں سے زندگی اور مدنیت کا اسلامی تصور شروع ہوتا ہے۔ خدا کی نظر میں ہم سب مساوی ہیں۔ یہاں مردوزن میں کوئی فرق نہیں۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے ہم سب ملکر ایک خاندان کو تشکیل دیتے ہیں جو خدا کا کنبہ "عیال اللہ" ہے۔ جب قرآن آنحضرت پر نازل ہوا تو انسانی جماعت کا نظام دنیا کے ہرگوشہ میں خواہ وہ عرب ہو یا ہندوستان، ایران ہو یا سلطنت روما، نسبی امتیازات اور تقسیم طبقات کی بنیاد پر قائم تھا۔ جب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) انسانیت کی مدد کے لیے آئے اور

اپنا پیغام، مساوات اور عقلی و اجتماعی آزادی کا پیغام سنایا تو ہر اس برہان کا قلع قمع ہو گیا جو اس بنیاد کی حامی تھی ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان برابری کا احساس مسلمان کے ذہن میں گہرا جما ہوا ہے اور میں ہر نقاد سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ احساس نہ عربی الاصل ہے، نہ ایران میں آپ اس کی جڑ کا پتہ لگا سکتے ہیں، وہ ہندوستانی تمدن کی پیداوار تو یہ بہرحال نہیں ہے۔ آپ جہاں بھی مسلمانوں کو ملتے دیکھیں گے خواہ دن میں پانچ دفعہ مسجد میں یا سال میں ایک دفعہ کعبۃ اللہ میں، وہیں آپ کو مسلمانوں کی تہذیب نظر آجائے گی۔ یہ برابری کا احساس، یہ بلالحاظ رنگ و نسل و مرتبہ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونا، یہ ایک مالک الکل آقائے کائنات کے سامنے ایک مشترک عبادت میں ساتھ اٹھنا، ساتھ جھکنا، ساتھ بیٹھنا، یہ اظہار عبودیت کے لیے ایک ہی مشترک زبان استعمال کرنا، ایک ہی تمنا ظاہر کرنا، یہی احساس مساوات اور یہی اس کا ظہور مسلمانوں کی تہذیب ہے۔ یہ ہندوستان میں بھی اسی طرح مل جائے گی جس طرح دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں دو مسلمان ملیں

اسلامی زندگی میں تہذیبی منازل

مشین اور سائنس کے اس دور میں بھی ولادت سے موت تک ایک مسلمان کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ وہ کون سے تہذیبی منازل ہیں جن سے اس کو گزرنا پڑتا ہے قطع نظر اس کے کہ وہ انفرادی طور پر ان کے اثرات کس طرح قبول کرتا ہے؟ یہ ایک راستہ ہے مسلمان کے قلب تک رسائی حاصل کرنے کا۔ ایک یقینی ذریعہ ہے اس کی تہذیب کو سمجھنے کا۔

جونہی کہ ایک مسلمان کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے ایک آواز اس کے کانوں میں پہنچتی ہے۔ یہ اس کا پہلا اصطباغ ہے۔ اس کو پانی سے اصطباغ نہیں دیا جاتا بلکہ خدا کی اپنی فطرت کے جوہر سے دیا جاتا ہے یہ آواز بالعموم باپ یا کسی بزرگ خاندان کی ہوتی ہے۔ یہ اس کو ایک پیام پہنچاتی ہے جو اس کی اپنی فطرت کا پیام ہوتا ہے:-

"اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔"

جیسا کہ خود رسول اللہ نے فرمایا یہ آواز آزادی کا اور عظمت انسانی کا پیغام دیتی ہے وہی آواز پھر کہتی ہے
"نیکی کے راستہ پر آؤ - بہبودی کے راستہ پر آؤ"۔

یہ آواز تکرار کے ساتھ بچہ کے اُس مشن کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے اس کو اپنی زندگی میں پورا کرنا ہے اور اُس کو وہ راستہ دکھاتی ہے جس پر اسے بلندترین نصب العین کی خدمت میں اپنی تمام توتوں کو وقف کر دینا چاہیے۔ اِس کے بعد یہ آواز اُنہی بولوں پر ختم ہو جاتی ہے جن سے وہ شروع ہوئی تھی ۔

"اللہ سب سے بڑا ہے - اس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں"

یہ چھوٹی سی سادہ رسم جو ایک نوزائیدہ بچے کے لیے ادا کیجاتی ہے، حالانکہ اس وقت وہ اپنے گردوپیش کی کسی چیز سے آشنا نہیں ہوتا، یہ اسلامی تہذیب کی ایک زبردست معنی خیز نشانی ہے اور اس چیز کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اسے آگے چل کر آزادی اور وحدت فی الحیات کی تہذیب کا احترام کرنا اور اسی کی پیروی کرنا ہے ۔ یہ مختصر سی پکار جو پیدا ہوتے ہی بچہ کو سنائی جاتی ہے بس اسی رسم کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ زندگی بھر اس کے ساتھ لگی رہتی ہے ۔ صبح آنکھ کھلتے ہی اور رات کو آنکھ بند کرنے سے پہلے وہ یہی پکار سنتا ہے۔ اور دن میں تین مرتبہ مکرر اس کے کانوں سے وہ آواز ٹکراتی ہے جو موذن اپنے منارہ سے بلند کرتا ہے ۔ ہر بار یہ صدا اس کو وہی پیغام یاد دلاتی ہے جو پیدائش کے وقت اس کے سامعہ میں اتارا گیا تھا یعنی فلاح اور عبودیت الٰہی کی دعوت کا پیغام ۔

درحقیقت اس تہذیب کی روحانی حیثیت ایسی ہے کہ جب زمین پر اس کی زندگی کا کام پورا ہو چکتا ہے اور اس کے اقارب اور احباب خدا حافظ کہنے کے لیے اس کے گرد جمع ہوتے ہیں تو وہی آواز پھر اس کے جسم پر سے گذرتی ہے اور یہ مجمع ایک صف میں دوش بدوش استادہ ہو کر اس کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ موت کے بعد بھی یہ آواز پھر اسی ترقی، اسی فلاح، اسی عبودیت الٰہی کی طرف بلاتی

ہے، کیونکہ موت اسلام میں اس چیز کا نام ہے جو ایک دوسرے بلند تر عالم میں زندگی کے ایک نئے باب کا افتتاح ہے۔ پھر دیکھیے۔ مرنے کے بعد بھی وہ قبر میں جس انداز سے لیٹتا ہے وہ اس کی تہذیب کا ایک نشان ہے۔ وہ لیٹتا ہے، مسالوں میں لپٹا ہوا نہیں، مستحکم تابوت میں محفوظ نہیں، بلکہ اس طرح کہ مٹی، مٹی سے ہم آغوش ہوتی ہے، اتنی ہی محدود جگہ میں جو دنیا کے ہر مسلمان کو برابری کے ساتھ ملتی ہے۔ اور یہاں دنیوی زندگی کی اس آخری منزل میں بھی اس کا منہ ایک ہی مشترک مرکز کی طرف پھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ہے مسلمان کی تہذیب۔ وہ ایک سادہ لباس میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہی چادریں جن کو اوڑھے ہوئے کبھی وہ اپنے رفقاء کے ساتھ میدان عرفات میں نظر آیا تھا" تاکہ سب ایک ایسے ہی سادہ لباس میں اسی ایک مشترک مرکز پر زندگی کے ایک ہی مشترک نصب العین کے لیے وفاداری کا اقرار کریں۔ یہ لباس اس کی تہذیب کا نشان ہے۔ ترکی ٹوپی نہیں پاجامہ نہیں۔ کوئی اور چیز بھی نہیں جس کو وہ وقت اور حالت کے لحاظ سے حسب ضرورت پہن بھی سکتا ہے اور اتار بھی سکتا ہے۔

ایک مسلمان کی زندگی میں ولادت اور موت کے ان دو مرحلوں کے درمیان بہت سے مرحلے ہیں جن کی تشریح کے لیے میرے پاس کافی وقت نہیں۔ مگر ان دونوں مرحلوں کے درمیان اس کو جو کچھ کرنا ہے اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ اس کی کتاب مقدس میں درج کر دیا گیا ہے۔ اور اس کتاب کی ہدایات کسی نہ کسی صورت میں بچپن سے لے کر آخر عمر تک ہمیشہ اس کے سامنے رہتی ہیں۔ یہی ہدایات اور ان کی وہ عملی صورت جو رسول کی سیرت پیش کرتی ہے، مسلمان کی شریعت پر مشتمل ہیں۔ اس کی خصوصیات کو اجمالی طور پر ذہن نشین کرنے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ: اولاً وہ مسلمانوں کی عبادت کے ضوابط مقرر کرتی ہے۔ ثانیاً وہ اُن فرائض کا تعین کرتی ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے حق میں ادا کرنے پڑتے ہیں چاہے وہ خاندان کے دائرے میں ہوں یا اس کے باہر۔ اور اس کے ساتھ وہ ان فرائض کی بھی تفصیل کرتی ہے جو مسلمانوں کو اُن غیر مسلموں کے حق میں ادا کرنے پڑتے ہیں جو ان کے نظام حکومت کا جز ہوں۔ نیز ان سب کے

حق میں سلطنت کے جو فرائض ہیں انھیں معین کر دیتی ہے ۔ آخر میں وہ معاشی خود اکتفائی کا ایک لازمی
نظام عمل مرتب کرتی ہے جس کی رو سے ہر وارث کو خواہ مرد ہو یا عورت وراثت میں منصفانہ حصہ
مل جاتا ہے اور غریبوں کو سہارا دینے کے لیے، خصوصاً بیوہ، یتیم، ضعیف العمر اور کمزور کی پرورش کے
لیے امیروں کی زائد دولت پر ایک خاص ٹکس عائد ہوتا ہے ۔ یہ خاص خاص امور ہیں جن کی طرف شریعت خبر
توجہ کرتی ہے ۔ اگرچہ ان کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں مثلاً پاکیزگی جسم و اخلاق، اکل و شرب، لباس
عادات، معاشرت وغیرہ جن میں وہ رہنمائی کرتی ہے ۔ ہدایت کے اس مجموعہ یا شریعت کا مقصد دراصل
ایک ایسی مدنیت کو نمود دینا تھا جو اپنی کارگاہ عمل میں زندگی کی مادی اور روحانی قوتوں کی ہم آہنگی
کا مظہر بن سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف اس نے ہر قسم کی مادی ترقی کے لیے سعی و عمل کی پوری آزادی
دے دی اور دوسری طرف ایسے حدود مقرر کر دیے جو اس سعی و عمل کو اتنا نہ بڑھنے دیں کہ وہ سوسائٹی
کے کسی دوسرے رکن کی اخلاقی یا مادی فلاح و بہبود پر دست برد کرنے لگے ۔ اسی لیے وہ ان فرائض
پر زیادہ زور دیتی ہے جو دوسروں کے لیے انسان کو ادا کرنے چاہییں اور کسی ایسے حق کی تائید نہیں
کرتی، جس کا مطالبہ فرائض سے بے تعلق ہو کر کیا جائے ۔ اس قانون کے بعض احکام کی تعبیروں
میں اختلاف ہوا ہے اور اسی اختلاف نے مسلمانوں میں متعدد مذاہب ((Shcools)) پیدا
کیے ہیں لیکن اصول دین میں ان کے درمیان بہت ہی کم اختلاف ہے۔

یہ شریعت یا قانون اسلام ایک تہذیبی مظہر ہے ذہن اسلامی کا اور مسلمانان ہند کی زندگی میں
اب بھی ایک زندہ قوت کی طرح کارفرما ہے جس طرح کہ وہ دوسرے اسلامی ممالک میں ہے ۔ اس لیے
کہ اس کا مقصد ہی مسلمان کے روزمرہ افعال و اعمال پر حکومت کرنا ہے ۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب تک
نفس مسلم میں حرکت و حدت کے اس قانون کی روح کارفرما رہی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت تک
یہ شریعت نئے حالات کے مطالبات کا جواب دیتی رہی اور تمدن کو ترقی دینے کے لیے مسلمانوں میں تازہ

روح پھونکتی رہی۔ اس حرکت کی روح نے جس چیز کے ذریعہ سے اپنا کام کیا ہے اس کا نام اجتہاد ہے بدقسمتی سے اجتہاد کی روح چند صدیوں سے ہم میں خوابیدہ پڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی رفتار زمانہ سے الگ ہوگئی ہے پستی اور اسلام فراموشی کی ان صدیوں پر پلٹ کر دیکھنا اور اس کے اسباب پر واویلا مچانا بے سود ہے۔ یہ "شریعت اسلام" تقریباً ایک جامد صورت میں ہم تک پہنچی ہے اور وہ بھی ایسے وقت جب کہ ہماری اپنی کوئی مرکزی تنظیم موجود نہیں جس کے ذریعہ سے ہم اس ملک میں اپنی روزمرہ زندگی کو منضبط کرنے کے لیے وہ اختیارات استعمال کرسکیں جو ضابطۂ شرعی ہم کو دیتا ہے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب جس کی اصلی شان شریعت ہی کے نفاذ سے ظاہر ہوسکتی ہے، آج اس کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، بلکہ اس کے وجود ہی سے انکار کیا جا رہا ہے، مگر میں پھر بھی یہ عرض کروں گا کہ اس موجودہ صورت میں بھی اس نے اپنی وہ خصوصیات کھو نہیں دی ہیں جو مسلمانوں کے ذہن میں ان کی قومی وحدت، اور اس اخلاقی اساس کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گی جس پر ان کے نظام اجتماعی کی عمارت قائم ہے۔ ان کا طریقۂ عبادت جو ان کو ایک دوسرے سے جوڑنے والی سب سے بڑی قوت ہے آج بھی اسی شکل میں موجود ہے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقرر کیا تھا مسجد کا رخ آج بھی اسی سمت پر ہے اور وہ پکار جو اس کے مناروں سے بلند ہوتی ہے وہی پرانی زبردست پکار ہے جس نے کسی زمانہ میں مسلمانوں کے اندر حرکت کی عجیب روح پھونک دی تھی۔ صنفی تعلقات میں، زندگی کے روزمرہ معاملات میں وہی اخلاقی معیار آج بھی مسلّم ہے خواہ افراد اس کی عملاً پابندی کریں یا نہ کریں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن زندہ ہے اور اب وہ ترجموں کے ذریعہ سے حرکت، وحدت، آزادی اور مساوات کا پیام ہر گھر میں پہنچا رہا ہے۔

نہضت جدیدہ اس طرح وہ تمام خصوصیات جو اسلامی تہذیب کی مابہ الامتیاز ہیں سب کی سب محفوظ ہیں۔ صرف ان کے مادی سہاروں کو ساتھ لگانے کی ضرورت ہے۔ گذشتہ چند قرنوں کے واقعات نے

ساری اسلامی دنیا میں اپنی مادی زندگی کی پستی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ ہر جگہ کے مسلمانوں میں اور مسلمانانِ ہند میں بھی بیداری کی علامتیں اور قوی علامتیں پائی جارہی ہیں۔ یہ وہی بیداری ہے جو بالعموم ان گری ہوئی قوموں میں پیدا ہوتی ہے جن کا ماضی شاندار رہا ہے۔ اب غیر مسلم قوموں کو کسی جگہ ایک انحطاط پذیر جماعت سے واسطہ نہ پڑے گا جیسی کہ اب تک مسلم جماعت رہی ہے بلکہ ایک ترقی پذیر نسل سے سابقہ پیش آئے گا جس میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب سے غفلت برتنے یا اس کا صحیح اتباع نہ کرنے ہی کی وجہ سے اس زدہ حالت کو پہنچی ہے۔ اب یہ نسل اپنے مرتبہ کی بازیابی کے لیے آگے بڑھے گی اور صرف اپنی گذشتہ تہذیب کا ورثہ ہی نہ طلب کرے گی بلکہ اس قوتِ حیات کو پھر سے تازہ کرے گی جو اس کے مذہب میں موجود ہے۔ یہ حیاتِ نو کونسی شکل اختیار کرے گی؟ اس کا تعین اس آزادیٔ عمل سے ہوگا جو ان لوگوں کو حاصل ہوگی۔ جہاں وہ برسرِ اقتدار ہوں گے یا جہاں اجتماعی ماحول خالص اسلامی ہوگا وہاں تو ان کا راستہ بالکل صاف ہے۔ وہ اٹھینگے تو اپنے بل پر اور گریں گے تو اپنے بل پر۔ مگر جہاں مثلاً ہندوستان میں وہ ایک تکونی (Triangular) زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں وہاں ان کو بر سبیل تنزل مصالحت (Compromise) کرنی پڑے گی۔ مختلف تہذیبوں کو مخلوط کرنے کا تخیل تو ایک خام خیال ہے ہندوستان میں تہذیبوں کا وفاق (A federation of cultures) ہی ایک دانشمندانہ حل ہے اور اسی منتہا کی طرف تمام کوششوں کو راجع کرنا چاہیے۔ یہ ایسا وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لیڈر چھوٹی چھوٹی ہنگامی اور خود بخود مر جانے والی چیزوں پر اصرار کریں۔ ان کو اپنی تمام قوتیں اُن اہم تر مسائل پر مرتکز کرنی چاہئیں جو ہندوستان میں ان کی تہذیب کے مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ شریعت کے اس پہلو کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے جس کے علمی اور معاشی اصولوں کو نہ سمجھنے اور ان سے غفلت کرنے کی بدولت ہی مسلمان اس حال کو پہنچے ہیں

اب ایسا بندوبست ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل معاشی حیثیت سے خود اپنے پاؤں کھڑی ہو اور علمی اور سیاسی حیثیت سے اتنی محفوظ ہو کہ اس کو ناجائز طور پر استعمال نہ کیا جا سکے۔

اسلام کا معاشی نظام العمل ہندوستان میں "شریعت" کے معاشی نظام العمل کے معطل ہو جانے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ہماری تاریخ کے قریبی دور میں احکام اسلامی سے انحراف کی بہت زیادہ سہولتیں بہم پہنچ گئی تھیں لیکن اب کہ اس ملک کے ہر باشندے کے لیے حالات بہتری پر ہیں اور اہل ملک کو اپنی معاشی زندگی کی تنظیم جدید کے لیے اپنے معاملات خود اپنے ہاتھ میں لے لینے کا موقع مل رہا ہے مسلمانانِ ہند کے ہر بہی خواہ کو اولین فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ کہیں یہ جماعت جو صدمات زمانہ کے باوجود زندگی کے ایک بڑے اجتماعی نصب العین کے لیے جی رہی ہے، کسی خالص مذہب شکم پرستی کی شکار نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے حکومت کی مشین کے ذریعہ سے اس کے داخلی وسائل معیشت کو شریعت کے مقرر کردہ اخلاقی طریقوں پر از سر نو منظم کر کے اس کی بھوک کا انتظام کر دینا ضروری ہے، اگر سندھ حکومت کو مسلمان اسی طرح اپنی حکومت کہنے کا حق رکھتا ہے جس طرح اس نظام سیاسی کے ہر دوسرے رکن کو حق ہے، تو اس کو اپنا پرسنل لا خود اپنے اوپر نافذ کرنے کا موقع اور اقتدار حاصل ہونا چاہیے۔ یہ سوال کہ اس نفاذ کی صورت اور اس کا انتظام کیا ہوگا اس کا تعلق تفصیلات سے ہے۔ باشندگان ملک کے غیر مسلم طبقوں کو اس تجویز میں "حکومت کے اندر حکومت" کا ہَوّا نظر آنے کی کوئی وجہ نہیں۔ حکومت کے واسطہ سے مختلف طبقوں میں ان کے اپنے پرسنل لا کا نفاذ اس ملک کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہے اور اگر اس کام کو بہتر طریقہ پر انجام دیا جائے تو اس میں کوئی نرالا پن نظر نہیں آسکتا۔ محض اپنے معاشی استقلال کی خاطر مملکت پر کوئی دباؤ ڈالے بغیر ایک ایسے سرکاری ادارہ کا مطالبہ کرنا مسلمانوں کا حق ہے جو مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام کرے، زکوٰۃ اور دوسرے محاصل جو مسلمانوں کے فاضل مال پر شرعاً عائد ہوتے ہیں وصول اور تقسیم کرے اور وراثت اور ازدواج

ایک قانون کو شریعت کی اصل روح کے مطابق نافذ کرے۔

روحانی زندگی اور اخلاقی معیارات میں نے مسلمانوں کی معاشی ضروریات پر جو خاص توجہ مبذول کرائی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان ضروریات کی تکمیل ہی بذات خود کوئی مقصد ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ "شریعت اسلام" زندگی کے مادی پہلوؤں پر بھی اتنا ہی زور دیتی ہے جتنا اخلاقی و روحانی پہلوؤں پر، تاکہ ہماری روزمرہ زندگی میں روحانیت اور مادیت کے درمیان ایک فطری اور خوش آئند ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ روحانی پہلو کے تحفظ کو عام طور پر ایک انفرادی یا شخصی چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات ان جماعتوں کی حد تک صحیح ہو سکتی ہے جن میں روحانی ترقی کو اجتماعی سعی سے تعلق نہیں ہوتا۔ اسلام میں انفرادی روحانی ترقی بلاشبہ زندگی کا ایک مقصد ہے جیسا کہ ہر مذہب میں ہوا کرتا ہے، لیکن اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس انفرادی ترقی کو پوری امت کی روحانی ترقی پر اثر انداز کرنا چاہتا ہے جس سے مسلمانوں کے اتحاد و استحکام کی روح اور جملہ نوع انسانی کی وحدت کا جذبہ تحریک میں آئے۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے ہمیشہ اس امر کو اہمیت دی ہے کہ ان کو ایک آزاد ماحول میں اپنی روزانہ نماز باجماعت ادا کرنے کی ضروری آزادی حاصل رہے۔ نماز باجماعت ہم میں ایک بڑی تہذیبی قوت ہے اور فطرۃً اس کو ہمارے تہذیبی تحفظات کے سب سے اہم امور میں شامل ہونا چاہیے۔ اسی طرح شریعت کی رو سے ہماری تمدنی و معاشرتی زندگی میں اخلاق کا جو معیار رہے اس کا احترام ہر اس قانون میں ملحوظ رکھا جانا چاہیے جو عام اہل ملک کی زندگی پر اثر ڈالنے والا ہو اور جس کے دائرہ میں مسلمان بھی آپ سے آپ آجاتے ہوں۔

تہذیبی انفرادیت یہ ہے ان تہذیبی تحفظات کی نوعیت جن کو مسلمان اس نئی سیاسی زندگی میں اپنے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کا ہندوستان میں اس وقت آغاز ہوتا نظر آتا ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہم وطنوں کے لیے زیادہ بہتر ہو گا کہ وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو سمجھ لیں اور ان کا دلی اشتراک عمل

حاصل کرکے آگے بڑھیں۔ یہ گمان کر لینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا کہ اسلامی تہذیب اور ہندو اکثریت کی تہذیب میں بہت کم فرق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی سطحی چیزیں دونوں میں مشترک ہیں لیکن وہ زیادہ تر مشترک آب و ہوا اور مشترک بازاری زندگی کی پیداوار ہیں۔ یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جو مگر کی معاشرتی زندگی کو ایک ہی قسم کا مرکب بنا سکتی ہوں۔ ان کی رسائی روح تک نہیں ہے۔ وہ دماغوں کو زندگی کے کسی مشترک اخلاقی تصور کے رشتہ میں منسلک نہیں کر سکتیں نہ مساوات کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ کسی مقدس تعلق کا مشترک احساس پیدا کر سکتی ہیں۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لیے میں دوسرے لوگوں کی تہذیب کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں تہذیبوں کی نوعیت میں بنیادی اختلافات کا پایا جانا ایک بدقسمتی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مرور زمانہ سے کوئی اساسی ہم رنگی آگے چل کر پیدا ہو جائے لیکن جب تک اختلاف باقی ہے کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلامی تہذیب کو تحفظ کی ضرورت نہیں ہے یا نہ ہونی چاہیے؟ خصوصاً جب کہ یہ تہذیب زندگی کے ایک ایسے عالمگیر روحانی قانون پر مبنی ہے جو نوع انسانی کی تفریق کے لیے نہیں بلکہ وحدت کے لیے گرم کار ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جمہوری ممالک میں بھی ایسی اعلیٰ تہذیبیں جو اقلیتوں کی زندگی کا مظہر تھیں کس طرح بزور شمشیر یا اکثریت کے استبدادی طرز عمل سے مٹ گئیں۔ ہندوستان کا مسلمان اس قسم کے امکان کو روکنے کا ارادہ رکھتا ہے جہاں تک بھی اس کا بس چلے۔

یکساں ترقی یہی وجہ ہے کہ مسلمان اُس اقتدار میں حصہ لینا چاہتا ہے جو حکومت کی مشین کو قابو میں رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ ملک کی ثروت میں بھی کافی حصہ کا طالب ہے۔ وہ ترقی ہی کیا جو اسے ایک طرف آئنی قوت نہ بخشے کہ وہ خود اپنی اور ہر اُس چیز کی جسے تہذیبی نقطۂ نظر سے وہ عزیز رکھتا ہے زمانہ کے تلوّنات سے حفاظت کر سکے اور دوسری طرف اُس کو ملک کی عام ترقی میں حصہ لینے کے ذرائع و وسائل مہیا نہ کرے۔ مسلمان اکثر صوبوں میں زمین کی ملکیت سے قریب قریب محروم ہیں۔ ملک کی

صنعتی و تجارتی زندگی میں بھی ان کا بہت کم حصہ ہے۔ اس کے ساتھ وہ تعلیمی حیثیت سے بھی ابھی تک پسماندہ ہیں اور ہمیشہ ساہوکار کے پھندے میں پھنسے رہتے ہیں۔ یہ رکاوٹیں اور کمزوریاں ہیں جنکی وجہ سے ترقی کی راہ میں ان کی رفتار سست ہے اور ان کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے عوام کو پستی سے اٹھانے کے لیے معاشی اصلاح کا جو لائحۂ عمل اس وقت پیش کیا گیا ہے وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے۔ اگر ملک کے تمام طبقوں کو ابھار کر ایک سطح پر لانا فی الواقع مقصود ہے تو مسلمانوں کے حال پر اس سے زیادہ توجہ کرنی پڑے گی۔ یہ اصلی محکِ امتحان ہے قومیت یا سیاسی حصہ داری کا، اگر اس چیز کو پائیدار اور ترقی پذیر بنانا ہے۔ آپ قومیت کے خوش آئند ترانہ کو ایک ایسا طوفان بننے کی اجازت نہیں دے سکتے جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کمزور پودوں کو جڑ سے اکھاڑتا چلا جائے۔ ہمکو دعا کرنی چاہیے اور امید رکھنی چاہیے کہ ہر جگہ عقل سلیم کا بول بالا ہو اور مسائل وطنی کا ایک اچھا حل تلاش کیا جائے۔ کیونکہ میرے خیال میں اسی پر ہندوستان کے مستقبل کی بہتری منحصر ہے۔ اگر ہمارے ہم وطن تقضائے وقت کے مطابق بن جائیں اور "فرقہ پرستی" کا شور مچانا کم کر دیں، تو وہ دیکھ لیں گے کہ اخلاقی و روحانی استعداد کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی طبقہ اتنا تیار نہیں ہے جو ہندوستان کو دنیا میں عزت کے مقام پر پہنچانے کے لیے مسلمانوں سے بڑھ کر اقدام عمل کی ذمہ داری سنبھال سکتا ہو۔

اردو کا مسئلہ: "شریعت" کے تہذیبی تحفظات کے علاوہ تہذیب کا ایک اور شعبہ بھی ہے جسمیں ہندوستان کا مسلمان اپنے حصہ کو جدید تقسیم میں محفوظ کرانے کے لیے اتنا ہی بےچین ہے۔ وہ علم و ادب کا شعبہ ہے اور اس میں مسلمان چاہتا ہے کہ اس زبان کے فطری نشو و نما میں کوئی رکاوٹ نہ ہو جس کو دوسروں کے ساتھ ملکر اس کی کوششوں نے اتنی ترقی دی ہے کہ وہ نہ صرف اس کی تہذیب کے اظہار کا ایک ذریعہ اور مسلمان کی وحدت کا ایک واسطہ بن گئی ہے بلکہ ہندوستان کے دوسرے

طبقوں سے بھی ایک زندہ رابطہ قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ یہ بذات خود ایک اہم مسئلہ ہے کیونکہ زبان جس میدان میں اپنی جولانی دکھاتی ہے اس کی سرحدیں تہذیب کے ہر دوسرے شعبہ سے ملی ہوئی ہیں اور اس بنا پر ضرورت ہے کہ اسکی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی جائے۔ ممکن ہے کسی اور موقع پر میں زیادہ تفصیل سے اس پر بحث کروں۔ مگر اس موقع پر بھی میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ اُس رجحان کے خلاف آواز بلند کروں جو خود میرے اپنے ادبی دوستوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے کہ محض ارباب سیاست سے مصالحت کی خاطر اردو زبان کو ہندوستانی یا ہندی ہندوستانی کا مبہم سا نام دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ روش نہ عالمانہ ہے اور نہ بے لاگ۔ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس زبان کو اس کے اصلی نام "اردو" کے بجائے کسی دوسرے نام سے یاد کیا جائے۔ یہ وہ نام ہے جو خود اس کے ماں باپ نے رکھا ہے اور ہمیں اس کو بدلنے کا کوئی حق نہیں۔ وراثت کا ایک حقدار چاہے تو اپنے حق سے دست بردار ہو کر اپنے الگ راستہ پر جا سکتا ہے۔ مگر دوسرا حقدار کیوں اس کی پیروی کرے؟ بلاشبہ مسلمان اس بات پر رنج محسوس کریگا کہ اس کے ہموطن دو عظیم الشان تہذیبوں کے باہمی رشتۂ اتحاد کو توڑنے کے لیے اس شدت کے ساتھ کوشش کریں جیسی کہ وہ کر رہے ہیں اور اپنے لیے ایک الگ راستہ بنائیں جیسا کہ وہ بنا رہے ہیں۔ ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی فی الحقیقت کوئی ضرورت نہ تھی۔ اردو زبان جو ہندو اور مسلمان دونوں کی ذہانت کا مظہر ہے آج اتنی کافی قوت رکھتی ہے کہ دونوں فرقوں کے تہذیبی افکار اس میں سما سکتے ہیں۔ وہ ہر زبان کے لیے کافی شیریں ہے۔ لیکن ہمارے دوست اس وقت سننے کی موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ نئی زبانیں اس طرح نہیں بنائی جاتیں اور زندگی کے فطری حوائج سیاسی نعروں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اس لیے مسلمان ان کے الگ ہو جانے سے پریشان نہیں ہے بلکہ اس کی پریشانی ایک اور چیز پر مبنی ہے جو زیادہ اندیشناک ہے۔ اسے خوف ہے کہ یہ لوگ ایک مصنوعی بانگ (جو اپنی ساخت اور معنویت کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے بالکل ایک اجنبی زبان ہے) پیدا کرنے اور تمام

ملک پر مسلط کر دینے کے جوش میں اردو زبان کی مزید ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالیں گے۔ دراصل یہی وہ خطرہ ہے جس سے اردو زبان کو محفوظ کرنے کی فکر اُسے لاحق ہے۔ اُس نے ان لوگوں کو حجت سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اردو زبان پہلے ہی سے ہندوستان کے لیے ایک مشترک زبان کا کام دے رہی ہے، اب اسی غرض کے لیے ایک نئی زبان پیدا کرنا تاکہ وہ اردو کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے یہ نیا اقدام پرلے درجہ کی فرقہ پرستی اور ہندوستان میں قومیت کے مفاد کے ساتھ کھلی دشمنی ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ملتا ہے (میں پنڈت جواہر لال نہرو ہی کا قول نقل کر رہا ہوں) کہ:۔

اکثریت کی فرقہ پرستی بہ نسبت اقلیت کی فرقہ پرستی کے قوم پرستی سے قریب تر ہے"۔

اس قسم کا ہے وہ تحت الشعور جو ہماری پبلک زندگی میں قوم پروری کے نام سے کارفرما ہے! اس کے بعد واقعہ یہ ہے کہ بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ میری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ مسلمان کو اس بات پر مترود نہ ہونا چاہیے کہ دوسرے لوگ ایک مصنوعی زبان کو اس ملک میں رائج کرنے کیلیے کیا کر رہے ہیں۔ ہر مصنوعی زبان کی طرح اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس کے پیشروؤں کا ہوا۔ البتہ خود مسلمان کو چاہیے کہ اردو کو ان بہترین چیزوں سے مالامال کرتا رہے جو اس کا ذہن مہیا کر سکتا ہے تاکہ وہ اپنے فطری راستہ پر ترقی کرے۔ اس کے ساتھ دوسروں کے لیے دروازہ بھی کھلا رکھنا چاہیے کیونکہ صرف یہی ایک زبان ہے جو ایک دن سارے ہندوستان کو متحد کر کے رہے گی۔ اس کی جگہ لینے والی کوئی اور زبان نہیں۔ پس مسلمان کو چاہیے کہ دروازہ کھلا رکھے اور مکان کو آرام دہ بنائے۔ مجھے یقین ہے کہ آوارہ بھائی ایک دن بھٹک بھٹکا کر پھر پلٹ آئیگا اور اپنا حصہ طلب کرے گا۔ مگر مسلمان کو اس کے طریقہ کی پیروی نہ کرنی چاہیے کہ خود رجعت پسند بن جائے اور حقیقت یہ ہے جیسا کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ، مسلمان اس وقت اگر رجعت پسند بننا بھی چاہیں تو نہیں بن سکتے۔ ان کی بڑی اکثریت کوئی دوسری زبان نہیں جانتی۔ کئی پشتوں سے وہ صرف اسی زبان کے ذریعہ اپنے علمی کام جیسے کچھ بھی وہ ہیں، چلا رہے ہیں۔ اب یہ ان کی مادری زبان بن گئی ہے اور

اسی وجہ سے ان کو عزیز ہے۔ اس میں ایسی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ ایک طرف اُن اسلامی افکار عالیہ کو جو ماضی سے ہم تک پہنچے ہیں، اپنی آغوش میں سنبھال سکتی ہے اور دوسری طرف ان خیالات کی بھی پرورش کرنے پر آمادہ ہے جو ہماری نشاۃ ثانیہ کے دور میں جو سامنے نظر آرہا ہے، ہمارے ذہن کی دنیا پر حکومت کریں گے۔ جس حد تک مسلمانوں نے اس زبان کے قالب میں اپنی روح پھونکی ہے اور جس حد تک انہوں نے اس میں اپنی قوت حیات منتقل کی ہے اُسی حد تک وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے کہ یہ زبان ان کی تہذیب کا بھی ایک مظہر ہے۔ اور ان کی یہ خواہش ہوگی کہ نہ صرف اس کے مفاد کی حفاظت کریں بلکہ اس کو ایک ایسا سہارا بنادیں جس پر اہل وطن کے ساتھ ان کے باہمی ربط اور حسن تفاہم کی بنا قائم ہوسکے اور یہی چیز ہے جس پر ہندوستان کی دائمی فلاح منحصر ہے۔

خاتمۂ کلام دوستو! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ جس دلچسپی اور صبر سے آپ نے میری تقریر سنی ہے میں اس کے لیے آپ کا شکرگذار ہوں۔ میرے لیے باعث مسرت ہوگا اگر اسلامی تہذیب کے اس تجزیہ میں مجھکو کم از کم اتنی بات ہی آپ کے ذہن نشین کرنے میں کامیابی ہوی ہو کہ مسلمانوں کی یہ تہذیب محض درزی کی دکان یا ڈرائنگ روم یا میوزک ہال کی تہذیب نہیں ہے۔ اور نہ یہ ایسی تہذیب ہے جس کے اجزاء خود آپس میں متزاحم ہوں، بلکہ یہ حرکت دو حدت فی الحیات کی تہذیب ہے اور اب بھی ہم میں پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔ جب اس کی اصولی نوعیت یہ ہے تو کیا یہ کبھی کسی صحیح قومیت یا بین الاقوامیت یا کسی ایسے نصب العین کی مخالف ہوسکتی ہے جو انسان کے شایان شان ہو؟